محترم مذہبی عالم مولانا سید محمد باقر شمسؔ

جناب سید محمد تقی صاحب، کراچی

معاشروں کی پسماندگی کتنے دردناک تہذیبی المیوں کو جنم دیتی ہے، اس کا احساس مجھے ہر اس بار ہوا جب میں نے مولانا محمد باقر شمسؔ صاحب سے ملاقات کی ۔ جب ان کی کوئی کتاب کوئی مضمون پڑھا ۔ کسی شخص کا تبحر، دقتِ نظر اور متعدد جہتی مطالعہ بھی وہ اعتراف حاصل نہیں کرتا، جس کا وہ مستحق ہے ۔ تاآینکہ وہ ایک ترقی یافتہ سماج میں پیدا ہونے کی خوش قسمتی کا حامل نہ ہو۔ مولانا محمد باقر شمسؔ اس ثقافتی المیہ کی زندہ مثال کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے ۔ وہ ایک مذہبی مورخ کے طور پر ایک مستند انشاء پرداز کی حیثیت کے مالک تو ہیں ہی، چند نئے نظریوں کو پیش کرنے والے اور ایک غیر جانبدار ادبی نقاد کا درجہ بھی رکھتے ہیں ۔ اتنا ہی نہیں، کتنے اور مختلف شعبے ہیں، جہاں ان کے غیر جانبدار قلم نے اپنی محاکمانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے ۔ ان پر عرب کلچر کے دانشوروں کا یہ قول صادق آتا ہے کہ اچھا مورخ وہ ہے، جس کے سر کی قسم کھائی جاسکے۔

لیکن شمس صاحب کا بڑا فکری کارنامہ ان کی وہ بحث ہے، جو انھوں نے آغازِ لسان کے سلسلہ میں کی ہے۔ افلاطون، میر باقر داماد اور ابن عباد کے اس نظریہ کو، جسے فطری نظریہ کہا جاسکتا ہے، اساس بنا کر انھوں نے جانوروں کی آوازوں کے بارے میں چند بڑی اہم اور دلچسپ باتیں کہی ہیں ۔ جہاں تک پرندوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں تو اب یہ طے ہوگیا ہے کہ وہ مخصوص بولیاں استعمال کرتے ہیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ تمام جانور شعور کی ابتدائی سیڑھی پر ہوتے ہیں، جبکہ ان میں سے بعض اس سیڑھی سے بھی آگے تک پہنچ جاتے ہیں۔ شعور کی ابتدائی منزل کا مطلب یہ کہ وہ تجربات سے ایک کلیہ بنانے کی اہلیت رکھتے ہیں، لیکن کسی کلیہ کو دوسرے کلیہ سے جوڑ دے کر دانست کا نیا زاویہ دریافت کرنے کی اہلیت سے محروم رہتے ہیں اور یہی فرق ہے، جو ہومو سے پینس، حیوان ناطق کو غیر حیوانِ ناطق سے ممتاز کرتا ہے۔

لسانیات کے سلسلہ میں باقر صاحب نے جس نئی سطح سے قاری کو متعارف کرایا ہے، کتنا اچھا ہوتا کہ کوئی اس کی روشنی میں بات کو مزید آگے بڑھاتا مگر پسماندہ معاشرہ کا ایک المیہ یہ بھی تو ہے کہ وہ ذہن کی نئی تخلیق کو مزید آگے بڑھانے کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے، بلکہ کسی ذہن کی عمقِ نظر کی داد دینے یا اس کا اعتراف کرنے کی اہلیت کا بھی بمشکل ہی مظاہرہ کر پاتا ہے۔

جناب باقر شمسؔ صاحب کے تبحر کا ایک اہم مظاہرہ ۔۔۔ مگر ذرا رکئے !۔۔۔ ان کی علمی شخصیت کے تو کئی اہم پہلو ہیں ۔ کثیر الجہتی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر لکھنا تو باقاعدہ کتاب ۔۔۔ چلیے! کتاب نہ سہی، ایک بڑا کتابچہ لکھنے کا تقاضہ کرتا ہے۔ پلوٹارک یونانی نے، جو تاریخ کے مشہور سوانح نگاروں کا سرخیل اور اخلاقی اقدار کی اساس پر بحث کرنے والوں میں نمایاں مقام رکھتا ہے، مشاہیر یونان و روم کے نام سے ایک تقابلی مقالہ لکھا ہے، جو کلاسکس یا امہاتِ کتب میں شامل ہے۔ اس سوانحی مجموعہ میں یونان اور روم کے متعدد اکابر کی زندگیوں کے کئی پہلوؤں اور جہتوں کو اخلاقی اقدار کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔

واضح طور پر شمس صاحب کی زندگی مصنفوں کے حلقہ سے تعلق رکھتی ہے، جبکہ پلوٹارک کا موضوع سیاسی شخصیتیں ہیں، تاہم کثیر الجہتی کے اعتبار سے وہ کسی ایسے انشاء پرداز کا موزوں تر موضوع بن سکتے ہیں۔ جو جم کر ان کی گونا گوں شخصیتوں کا جائزہ لے سکے۔

جی تو چاہتا تھا کہ تنقید اور زبان و ادب کے دوسرے شعبوں میں ان کے قلم کی جولانی، تاریخ عرب پر ان کی گہری بصیرت، علم کلام میں ان کی استدلالی قوت اور خاص طور پر لکھنؤ کی ثقافتی زندگی پر ان کی دلچسپ تحریروں کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے، مگر کرے کیا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ بہر حال یہ ایسی خدمات ہیں جن کی توصیف میں بمشکل ہی مبالغہ سے کام لیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے موجودہ دور میں جب ثقافتی سرگرمیوں کو کچل ڈالنے کی خواہشیں بہت سے دلوں میں مچلتی رہتی ہیں، ان کے اس مضمون کا ذکر ضروری ہے، جس کا اشاعت پذیر نہ ہونا ایک المناک سانحہ ہے۔ یہ مقالہ انہوں نے موسیقی کے بارے میں لکھا تھا، مگر وہ منصۂ شہود پر اس لیے نہ آسکا کہ کچھ لوگ سچائیوں کو عوام تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ بنے کھڑے ہیں۔ ہر چند مصنف کا خیال یہ ہے کہ مضمون کی عدمِ اشاعت کا سبب وہ ٹیڑھے میڑھے الفاظ تھے جو بوڑھی انگلیوں نے لکھے تھے اور اخبار کے سب ایڈیٹر کے لئے ناقابلِ فہم بن گئے، مگر وجہ کچھ بھی ہو، ایک محترم عالم کے قلم سے اس بات کا اعلان کہ موسیقی یا غنانہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ عبادت کا درجہ بھی رکھتا ہے، بلاشبہ ایک اہم ثقافتی خدمت ہوتی، جو افسوس کہ حلیۂ وجود نہ پہن سکی۔

اس ضمن میں یہ بات خاص طور پر پیشِ نظر رہے کہ باقر شمس صاحب لکھنؤ کے ایک ایسے محترم مجتہد کے فرزند ہیں، جنھیں یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ عراق میں عرصہ تک درسِ خارج لیتے رہے، جبکہ برِ صغیر میں مقیم کسی مجتہد نے آج تک درس خارج نہیں لیا اور لیا تو عراق یا ایران جاکر۔ درس خارج کے سلسلہ میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ سیمینار کی ایک شکل ہے۔ ''سیمینار'' کی اصطلاح کا ''مذاکرہ'' کے مفہوم میں استعمال صحیح نہیں ہے۔ ''مذاکرہ'' ''سمپوزیم کا ترجمہ ہے، ''سیمینار'' کا نہیں۔ قدیم تہذیبوں میں درسِ خارج کا طریقہ مقبول تھا۔ ہند قدیم کے رشی اور منی عموماً اسی طرزِ تعلیم کو اپناتے تھے۔ افلاطون کا اکیڈمی میں بھی درسِ خارج کا سا انداز تھا۔

یہاں اس بات کا بھی ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ افلاطون موسیقی کی تعلیم کو لازمی مضمون کی حیثیت دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ موسیقی ذہن انسانی کو متوازن اور موزوں بنانے کا موثر ذریعہ ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میں اپنے موضوع سے بہت دور چلا گیا ہوں، لیکن یہ بات تو آپ سنتے چلیں کہ افلاطون آجکل کئی اکابر فلسفیوں اور صفِ اول کے سائنسدانوں کا سب سے بڑا فکری گرو مانا جاتا ہے۔ ''ٹائمز'' ویکلی نے، جسے مغربی صحافت میں محترم درجہ دیا جاتا ہے، خاص طور پر اصرار کیا ہے کہ امام خمینیؒ نے امارتِ فقیہ کا نظریہ افلاطون کی ریپبلک سے لیا ہے، جسے پروفیسر برٹرنڈ رسل فکر مغربی کا سب سے بڑا شاہکار خیال کرتے ہیں۔

بات دور چلی گئی جبکہ اتنی دور نہیں جانی چاہیئے تھی۔ تو کہنا یہ تھا کہ باقر شمس صاحب نے، جو خود ایک محترم مذہبی عالم کا مقام رکھتے ہیں، ایک ایسا موقف اختیار کیا ہے، جو فنکاروں میں عمومی طور پر اور اسلام کے گہرے فکری مزاج سے آگہی رکھنے والوں میں خصوصی طور پر بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شمس صاحب نے اپنی ثقافتی تحریروں میں جس حریتِ فکر کا مظاہرہ کیا ہے اور فنکاروں کی سرگرمیوں کو جس توجہ اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ خود ان کی شخصیت کی قدآوری کا ہمیشہ ایک زندہ ثبوت بنا رہے گا۔

جوشؔ صاحب کے ادبی رتبہ پر نہایت دلچسپ بحث کرنے والے بلکہ تنقیدی ادب کے محققانہ نمونوں کا کافی بڑا مجموعہ ادبی سرمایہ میں شامل کرنے والے مولانا شمس صاحب کے قلم نے علمِ کلام میں بھی اپنی دقتِ نظر کے ثبوت فراہم کیے ہیں۔ انھوں نے آرگومنٹ بائی ڈیزائن، استدلال بمقصدیت کے ذریعہ

ذات باری تعالیٰ نے وجود وثابت کیا ہے استدلال بمقصدیت جدید مغربی علمِ کلام میں بھی خاصا مقبول رہا ہے اور گذشتہ تین عشروں میں سائنسی علمِ ہیئت نے بھی اس کی صحت کو بہت زیادہ مضبوط بنیادیں مہیا کردی ہیں۔ استدلال بمقصدیت کا مفہوم یہ ہے کہ اس کائنات میں بڑے پیمانے پر ایسے مظاہر موجود ہیں۔ جن سے یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ ایک متعین مقصد اور ڈیزائن کے تحت اس عالم کا وجود ممکن ہوا ہے، جس کا واضح نتیجہ یہی ہے کہ کائنات کو ایک باشعور ہستی نے تخلیق کیا ہے۔

مولانا محمد باقر شمسؔ صاحب طبقۂ علماء سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن انھوں نے کاپرنیکی علمِ ہیئت، یعنی جدید دریافتوں کی روشنی میں مذکورہ استدلال کی اساسیں قائم کی ہیں اور واضح طور پر یہی طریقہ حقیقت پر مبنی ہے، اس لئے کہ عہدِ نو نے ایک ایسی کائنات سے ہمیں متعارف کردیا ہے، جس سے قدیم معاشرے محض ناواقف تھے، لیکن یہ آخری جملہ سنیئے، ذرا زیادہ ایقان کے ساتھ لکھ دیا ہے، ورنہ ایسے کئی مضبوط شواہد بھی سامنے آگئے ہیں ،جن کو مذکورہ نقطۂ نظر کی تردید میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال یہ تو ضرور مانا جاسکتا ہے کہ معلوم تاریخ کی حد تک جو دو متقابل ہیئتی نظریے رہے ہیں، یعنی بطلموسی نظامِ کائنات اور کاپرنیکی یا زیادہ صحیح لفظوں میں فیثاغورثی نظامِ کائنات ۔۔۔ ان میں اول الذکر تو صرف لگ بھگ بیس کروڑ میل کا فاصلہ رکھنے والا نظام تھا، جبکہ ثانی الذکر (یعنی جدید ہیئت) نے جس کائنات سے ہمیں متعارف کردیا ہے، وہ کم از کم پندرہ ارب سال شعائی کا فاصلہ تو رکھتی ہے ہی اور یہ تو سائنسدانوں کا بیان ہے جبکہ متعدد وجوہ کی بنا پر، جن کا یہاں تذکرہ ممکن نہیں، اس فاصلے کو کئی گنا بڑھانا بھی محض ناگزیر نظر آتا ہے۔

یوں آپ کہہ سکتے ہیں کہ کاپرنیکی نظامِ کائنات حقائق کائنات کی زیادہ صحیح نمائندگی کرتا ہے، لیکن بات کو ذرا زیادہ گہرائی میں اتر کر ٹٹولا جائے تو صورتحال بالکل ہی مختلف نظر آتی ہے

کاپرنیکی نظامِ عالم، بنیادی طور پر حرکتِ ارض کے مفروضہ پر قائم ہے۔ حرکتِ ارض کا تصور قدیم مصر میں بھی بعض حلقوں میں موجود تھا، لیکن اس نے زیادہ منظم شکل فیثاغورث کے مقلدین میں حاصل کی اور اسی لئے عرب حرکت ارض کے تصور کائنات کو فیثاغورث سے منسوب کرتے ہیں۔ اس کے برعکس بابلیوں نے سکون ارض کے نظریہ کو اپنایا، جو تمام دوسری قدیم تہذیبوں کا بھی پسندیدہ نظریہ رہا اور اس وقت یہ عجیب صورتحال سامنے ہے کہ زمین کی حرکت کا یہ نظریہ تمام سائنسی ثبوتوں سے محروم ہو چکا ہے۔

کائنات کا نیا تصور (A New Concept of the Universe) میری انگریزی کتاب کا نام ہے، جو مراحلِ تکمیل سے گذر کر اب منزلِ طباعت میں داخل ہو رہی ہے۔ اس کتاب کے ایک خاصے بڑے حصہ میں اس موضوع پر بھی بحث کی گئی ہے اور اگر آپ مجھے اس جملہ کو لکھنے کی اجازت دیں تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مذکورہ بحث کے مطالعہ کے بعد حرکتِ ارض پر اصرار محض مکابرہ ہی قرار پائے گا، سنجیدہ سوچ نہیں۔

باقر شمسؔ صاحب نے حرکتِ ارض کے تصور کو اپنایا ہے بلکہ ایک وہی کیا جدید عہد کے کئی مجتہدین عظام، علامہ خوئی جو مجسمۂ معقولات کہے جاتے تھے، امام خمینی اور مولانا سید علی نقی صاحب، یعنی وہ حضرات جن کو اجتہاد کے سب سے بلند درجہ یعنی آیۃ اللہ پر پہنچنے کا اعزاز حاصل تھا، تعینِ وقت سے متعلق مسائل فقہی کا فیصلہ حرکتِ ارض کے فرضیہ کے تحت کرتے تھے اور یہ تو بہرحال واضح ہے کہ تعینِ وقت میں حرکت یا سکونِ ارض کا کوئی سا نظریہ بھی ہو، اپنایا جاسکتا ہے، جس سے مظاہر کائنات کی توضیح و تشریح میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ البیرونی جو مسلم کلچر کے ماہر ہیئت دانوں اور استادانِ فن نجوم میں شامل تھا، اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ حرکت وسکون ارض کا مسئلہ کبھی طے نہ ہوسکے گا، تاہم یہ بھی ہے کہ اس کے حل پر کائناتی مظاہر کی وضاحت موقوف نہیں ہے۔ اس لئے کہ صرف حوالہ کے مرکز ہی میں تو فرق پیدا ہوگا، جس سے کسی آسمانی مظہر کی تشریح میں رکاوٹ پیدا نہ ہوگی۔ البیرونی کی

اس رائے پر تعجب نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ مستقبل میں ایسے حساس ،باریک بیں اور دوررس وسائل اور آلات بجالانے کا اندازہ کرنے کا امکان موجود نہ تھا جو ابعاد کی پہنائیوں اور دقیقوں کے اربویں جزو کا بھی تعین کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور اس لیے حرکت ارض کے پیدا کردہ فرق کو ناپ سکیں، اسی وجہ سے حرکت اور سکون ارض کے اختلاف کو البیرونی کا لاینحل کہنا بالکل صحیح تھا۔ گذشتہ سطور میں ''استدلال بمقصدیت'' کا ذکر آیا تھا۔ نامناسب نہ ہوگا اگر اس ضمن میں چند اور باتوں کا ذکر بھی کردیا جائے۔۔۔ گو مجھے بہر حال اختصار سے کام لینا پڑے گا قلتِ وقت کے پیشِ نظر کتاب کی اشاعت اس مضمون کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔ استدلال بمقصدیت کو ارسطو نے دوسرے پہلو سے لیا ہے۔ ارسطو کا کہنا یہ ہے کہ کائنات میں ضبط و تنظیم پائی جاتی ہے۔ انواع کی تقسیم۔ مثلاً تدریجی سلسلہ کہ پہلے مرحلہ پر معادن، پھر نباتات اور حیوانات و انسان کی جدا جدا نوعیتیں پائی جاتی ہیں اور ان سب کی کثیر تحتی تقسیمیں بھی ہیں، جو سب کی سب جدا جدا دائرے رکھتی ہیں۔ گلاب کا بیج گلاب ہی پیدا کرے گا اور گیندے کا بیج گیندا وغیرہ خصوصاً یہ حیرت انگیز پہلو بھی سامنے رکھئے کہ ارسطو نے معادن سے انسان تک کی جو تدریج لکھی ہے، وہ جدید تصور سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

ارسطو کا کہنا یہ ہے کہ کائنات کے تمام اجزا ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، جن سے ایک کل وجود میں آتا ہے۔ یہ ترتیب مقصدیت اور منصوبہ جوئی کی نمائندگی کرتی ہے، لیکن مقصدیت کے اس استدلال کو جس انداز پر خانوادۂ اہلِ بیتؑ کے چھٹے امام، امام جعفر صادقؑ نے استعمال کیا ہے، وہ حیرت انگیز بھی ہے اور نادر بھی ''بحار الانوار'' کے ''باب التوحید'' میں امام جعفر صادقؑ اور ایک ہندو فلسفی کے درمیان وجودِ باری کی بحث کو بیان کیا گیا ہے۔ امامؑ کا ارشاد یہ ہے کہ ہر چیز ایک مقصد کے لئے وجود میں آئی ہے۔ ''ہڑ'' ہی کو لے لیجئے اس کے کس قدر فوائد ہیں بلکہ انسان کی جنسی سرگرمیوں کو لیجئے کہ اس کو مدد پہنچانے کے لئے کیا کیا اقدامات کئے گئے ہیں۔ ایک تفصیلی گفتگو کے بعد امامؑ نے نتیجہ نکالا کہ اگر ''نیچر'' ان فوائد پر مشتمل ہے تو کیوں نہ نیچر کو خدا مان لیا جائے۔ نیچر کو خدا ماننے کی رخصت دے دینا اور وہ بھی مذہبی دنیا کی محترم ترین شخصیتوں کے ایک محترم ترین رکن کی طرف سے، ایک ایسا انقلابی اور غیر معمولی تصور ہے، جو ایک بیحد طاقتور ذہن کی طرف سے ہی دیا جاسکتا ہے۔ پھر ضمناً اس متعلقہ نتیجہ کو بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ ''نیچر'' کو خدا مان لینے کا مشورہ وحدت الوجود کے تصور کو پیش کرنے کا حسین ترین اندازِ بیان بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ یاد رہے !محقق طوسی نے بھی اپنی فکری سرگرمیوں کے آخر میں کہا تھا کہ ''از وست'' صحیح نہیں ہے۔ ''ہم اوست'' ہی صحیح ہے۔

آقائے خوئی کا اوپر ذکر آیا ہے۔ خوئی صاحب، جن کا ماضی قریب میں انتقال ہوا ہے، ''آیۃ اللہ'' ہونے کے علاوہ ''اعلم'' کے درجہ پر بھی فائز تھے۔ ''اعلم'' (سب سے بڑا عالم) کا خطاب مسلم معاشرہ میں علم کی اہمیت کے اظہار کی حیثیت رکھتا ہے، جبکہ مثلاً عیسائی حضرات کے کیتھولک فرقہ کے سب سے بڑے مذہبی رہنما کا نام ''پوپ'' ہے، یعنی سب سے بڑا باپ۔ ایران اور عراق کے باخبر مذہبی حلقوں کا بیان ہے کہ اعلم ہونے کی وجہ سے وہ مسلم امت کی کل آبادی کے چالیس فیصد حصہ کے مذہبی قائد تھے۔ ان کا قیام نجف میں تھا، جہاں ایک ہزار سال سے عموماً اعلم حضرات قیام کرتے تھے، مگر موجودہ وحشی حکومت کی وجہ سے اب موجودہ اعلم، جناب محمد رضا پائگانی، قم میں قیام فرما ہیں۔



ہو ضعف تو طاقت کی دوا دیتے ہیں
آئے جو پسینہ تو ہوا دیتے ہیں
پیری میں ضیا آنکھ کی یہ کہہ کے چلی
ہنگام سحر شمع بجھا دیتے ہیں

دعبل ہند مولانا سید فرزند حسین ذاخر اجتہادی